اُردو نظم میں مشرق بطور سیاسی وحدت

(اقبال، راشد اور سلیم احمد کے خصوصی حوالے سے)

عنبرین منیر☆

Abstract:

East is not a non living natural object, rather it is a human division of the world on the basis of culture, norms, life styles and behaviours. East is Islamic world which never could become a political unit after the Caliphat. Iqbal, Noon Meem Rashid and Saleem Ahmed in particular and Urdu poets in general have mourned at the fall of this unity. Iqbal was given title of Poet of the East but that does not lessen Rashid or Saleem Ahmed's stature or point of view. All three of them have given ideas of Muslims' unity to get rid and fight against the exploitation of West. Now that the East is badly caught in the claws of Western colonialism, idea of a political unit has become more meaningful. Thus this concept and poets have become more relevant to the contemporary scenario.

ایڈورڈ سعید اپنی کتاب مشرق شناسی میں رقمطراز ہیں:

> ''مشرق بطور ایک عنصر قدرت کوئی غیر متحرک چیز نہیں یہ محض موجود نہیں جیسا مغرب صرف موجود نہیں۔ یہ انسان کے بنائے ہوئے جغرافیائی علاقوں کی تقسیم ہے اس لیے مغرب کی طرح مشرق بھی محض تصور نہیں بلکہ حقیقی وجود ہے۔ ایک طرز زندگی، تاریخ، رسوم، سیاسی، سماجی، معاشی نظریات اور ثقافتی نظام ہے جس کی بنیاد روحانیت اور مذہب پر قائم ہے۔''[۱]

تاریخ کے آئینے میں مشرقی تہذیب دنیائے قدیم یعنی چھ یا سات ہزار سال قبل مسیح میں وادی نیل اور ایشیا کے زرخیز علاقوں میں جلوہ گر ہوئی۔ یہیں مصر، بابل اور ایشوریہ تہذیب پھولی پھلی۔ یہ پیغمبروں کی دھرتی روحانی اقدار اور علم و دانش کی علمبردار ٹھہری۔ ۱۵۰۵ء میں جب بابر کی حکومت برصغیر میں مضبوط ہو رہی تھی مغرب میں سرمایہ دارانہ نظام اور صنعتی انقلاب نے جنم لیا۔ مغربی ممالک خام مال کی تلاش اور تجارتی کمپنیوں کے قیام کے بہانے مشرق میں داخل ہوئے اور بالآخر بزور قوت اپنی تجارتی اجارہ داری کے بعد سیاسی استبداد سے نوآبادی سامراجی

☆ ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، گورنمنٹ اپوا کالج برائے خواتین، لاہور

نظام کو قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اس غاصبانہ تسلط سے مشرقی معاشرہ وتہذیب جس انتشار اور بے چینی کا شکار ہوئی ادیب اور شاعر اُس سے محفوظ نہ رہ سکا۔

اقبال اسی دورِ محکومی میں پیدا ہوئے اسلامی اقدار نے اُن کی شخصیت کو سینچا، ہوش سنبھالا تو برصغیر اور دیگر مسلم وغیر مسلم اقوام مشرق کو مغربی سامراجی تسلط کا اسیر پایا۔ مغلوب قوم میں عام طور پر احساسِ ذات اور نرگسیت اُبھر آتی ہے وہ اپنی زمین کے چھن جانے کے بعد اپنے قومی تشخص کی حفاظت زیادہ دل جمی سے کرنے لگتے ہیں لیکن غلامی اور خودداری کا ساتھ ممکن نہیں۔ اسی لیے اہل مشرق کا فکری رجحان مغرب کی ذہنی غلامی کی طرف افزائش پذیر ہونے لگا۔ قیام انگلستان کے دوران اقبال مغربی تعلیم وتہذیب کی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ ساتھ غاصبانہ چالوں، سرمایہ دارانہ ذہنیت اور سیاسی حلیہ سازیوں سے آگاہ ہوئے۔ اقبال بحیثیت ہندوستانی مسلم مشرق اور ملت اسلامیہ سے گہری ذہنی وابستگی رکھتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے اسلام کو اقوام مشرق کی حقیقی روح اور مرکزی رابطہ قرار دیا اور مسلم اقوام مشرق کو سیاسی وحدت کا راستہ دکھایا۔ ایسا نہیں کہ جب وہ اقوامِ مشرق کو ہیئت اجتماعیہ انسانیہ بننے کی تلقین کرتے ہیں تو چینی، جاپانی اور غیر مسلم ہندوستانیوں کو اس وحدت سے خارج کر دیتے ہیں۔ فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

> ''اقبال نے ڈاکٹر قاضی عبدالحمید کو بتایا تھا کہ اسلام میں خلافت راشدہ کے بعد اب تک ایک بھی متحدہ ریاست قائم نہ ہوسکی اور نہ ہی اس کی کوئی اُمید دکھائی دیتی ہے البتہ اتحاد اسلامی کا تخیل اس معنی میں ضرور عملی جامہ پہن سکتا ہے کہ تمام اقوام آزاد ہوں اور وہ اسلامی مقاصد کے لیے باہم ایک دوسرے سے تعاون کریں یہ حکومتیں ایک قسم کی اسلامی قومی حکومتیں ہوں گی، مگر ان قومی حکومتوں کی بنیاد اخلاق اور محبت پر استوار ہونی چاہیے ظاہر ہے مغرب کی قومیت کے برعکس ہیئت اجتماعیہ کا یہ ایسا وسیع نقطہ نظر ہے جس میں نہ صرف مسلمان بلکہ ساری انسانی برادری جمع ہوسکتی ہے۔''[۲]

اس بیان سے اقبال کی سیاسی بصیرت روشن ضمیری اور اسلامی تعلیمات سے والہانہ عقیدت کے ساتھ ساتھ بے تعصبی کا ثبوت ملتا ہے۔ اقبال جانتے ہیں کہ کسی خطہ زمین کی مختلف النوع اقوام کو سیاسی وحدت میں ضم کرنے کے لیے مشترکہ سیاسی مفادات، یعنی مغرب کی غلامی واستحصال سے آزادی اور مشترکہ سیاسی حریف یعنی فرانس برطانیہ اور امریکہ کے مغربی اتحاد کا ہونا لازمی ہے۔ انہی دونوں بنیادوں پر وہ اقوام مشرق کو سیاسی وحدت میں ڈھلنے کی دعوت دیتے۔

اقبال کی نظموں میں مشرق بطور سیاسی وحدت ارتقائی منازل طے کرتا ہوا اُس منزل پر پہنچ جاتا ہے، جہاں اقبال کے اکثر فلسفیانہ اور ملی تصورات اسی تناظر میں معنویت پاتے ہیں۔ بانگ درا کی پہلی نظم 'ہمالہ' میں ہمالہ کشور ہندوستان ہی نہیں کشور مشرق بھی ہے جبکہ جلد ہی نظم 'ترانہ ہندی' مشرقی اقوام کی محبت میں 'ترانہ ملی' بن جاتی ہے۔ نظم عبدالقادر کے نام میں وہ اہل مشرق کو خود احتسابی کا درس دیتے ہیں۔ اسی دور سے تنقید مغرب اور تنبیہ مشرق اُن کی

شاعری کا مستقل حوالہ بن جاتا ہے نظم مارچ ۱۹۰۷ء میں اقبال مشرق کے درماندہ کارواں کے لیے اپنے اشعار کو شعلہ بار قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

(کلیاتِ اقبال، ص ۲۵۰)

اقبال مشرق کے شہروں مسجدوں اور دیگر مذہبی آثار میں خصوصی دلچسپی کا اظہار 'بلادِ اسلامیہ' اور گورستان شاہی جیسی نظموں میں کرتے ہیں۔ مشرقی قوموں کا عروج و زوال نظم 'شکوہ' کا مرکزی موضوع بن جاتا ہے۔ اس نظم میں مشرق ایک ایسے کردار میں ڈھل جاتا ہے۔ جو مختلف مذاہب، اقوام، رنگ و نسل اور علاقائی حدود کا گہوارہ ہے انہی قوموں میں سے مسلم قوم نے اُسے عروج کے سنہری لمحات عطا کیے اب وہ اسی قوم کے زوال پر نوحہ گر ہے۔ نظم 'جوابِ شکوہ' براہِ راست مشرق کے مسلمانوں کی کوتاہیوں، فرقہ بندیوں اور بے عملی کی تصویر کشی کرتی ہے۔ جس میں اقبال مسلمانانِ مشرق کو مافوق القومیت نظام میں منظم ہونے کی تلقین کرتے ہیں:

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی، دین بھی ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

سید ابوالحسن ندوی رقمطراز ہیں:

''وہ مشرق کی اسلامی اقوام کو ملامت کرتے ہیں جن کا منصب قیادت و امانت کا تھا لیکن وہ پست درجہ کی شاگردی اور ذلیل قسم کی نقالی کا کردار ادا کر رہی ہیں۔''[۳]

اقبال نظم 'شمع و شاعر' میں اسی احساس ذلت و زیاں کے کھو جانے پر اظہار تاسف کرتے ہیں اور 'خضر راہ' میں مشرق اور ایشیا کا فرقہ دیرینہ چاک چاک دیکھتے ہیں۔ اقوامِ مغرب کا دیو استبداد جمہوری نظام کی نیلم پری بنا ہوا ہے جس سے سادہ دل مشرقی مرعوب ہوئے جا رہے ہیں۔ اسی مقام پر اقبال سیاست کو مذہب کے تابع رکھتے ہوئے مسلم اقوام مشرق کی جغرافیائی وحدت کو وسیع کرتے ہیں۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

(کلیاتِ اقبال، ص ۴۶۹)

'بانگ درا' کی آخری نظم 'طلوعِ اسلام' دراصل طلوعِ مشرق کا استعارہ ہے، مسلمانانِ مشرق نہ صرف مشرق کو آزاد کر سکتے ہیں بلکہ مغرب میں بحیثیت آزاد وحدت اثر و رسوخ بھی پیدا کر سکتے ہیں۔

یہ نکتہ سرگزشت ملت بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوام زمین ایشیا کا پاسباں تو ہے

(کلیاتِ اقبال، ص ۴۸۰)

اقبال کے فلسفہ و فکر میں مشرق کی مرکزیت کا احساس اُن کے ۱۹۲۲ء میں شائع ہونے والے فارسی مجموعہ کلام 'پیامِ مشرق' کے عنوان سے بآسانی کیا جا سکتا ہے۔ اس مجموعہ کا محرک تصنیف اقبال جرمن حکیم حیات گوئٹے کا مغربی دیوان قرار دیتے ہیں جس سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ مغرب اپنی کمزوری روحانیت سے بیزار ہو کر مشرق کے سینے سے حرارت تلاش کرنے کا متلاشی ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے خاتمے اور انسانیت سوز انجام نے مشرق کو مزید شکست و ریخت سے دوچار کر دیا تھا۔ اقبال سے دگرگوں حالات میں مسلمانوں کو خود اعتمادی پر مائل کرتے ہیں۔

فتح محمد ملک لکھتے ہیں:

''اقبال کی زندگی کا نصف آخر مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق کو مغرب کے تہذیبی اور سیاسی استحصال سے نجات کی راہیں سمجھانے اور خودی کی پرورش کی ترغیب دینے میں صرف ہوا۔''[۴]

اقبال کا مجموعہ 'بالِ جبریل' کی نظمیں مسجد قرطبہ اور ذوق و شوق مسلم مشرق کے عہد رفتہ اور جنت گم گشتہ کی بنیاد جذبہ عشق پر رہ کر بحال کرنے کا پیغام دیتی ہیں۔ یہاں مشرق کو حرارت بخشنے والے قافلہ حجاز میں حسین کی کمی اقبال کو بے چین کر دیتی ہے۔

'ساقی نامہ' ایشیا کے حالات اور سیاسی انقلابات کے تناظر میں لکھی جانے والی رجائی لب و لہجہ کی نظم ہے۔ جس میں اقبال اقوامِ مشرق میں مسلم اور غیر مسلم کی تفریق کو مٹا کر گراں خواب چینی کے سنبھلنے کو خوش آئند ٹھہراتے ہیں۔

گیا دور سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا

(کلیاتِ اقبال، ص ۴۸۰)

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے

(ص ۴۴۷)

اقوام مشرق سے رابطے کے لئے اقبال اپنی فارسی مثنوی 'پس چہ باید کرد اے اقوام شرق' میں مشرقی قوموں کو ہیئت اجتماعیہ کے طور پر مخاطب کرتے ہیں اس کے علاوہ اُردو کی اکثر نظموں میں مشرقی قوموں کو انفرادی توجہ بھی دیتے ہیں۔ اقبال خود کشمیری تھے اور کشمیری قوم کا کرب اُن کا اپنا کرب تھا اسی لیے 'ارمغانِ حجاز' کا ایک گوشہ اقبال نے 'ملا زادہ ضیغم لولابی کشمیری کی بیاض' کے عنوان سے منسوب کیا ہے۔ جس میں کشمیریوں کو مغرب کی تاجرانہ ذہنیت سے آگاہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

ضمیر مغرب ہے تاجرانہ، ضمیر مشرق ہے راہبانہ
وہاں دگرگوں ہے لحظہ لحظہ یہاں بدلتا نہیں زمانہ

(کلیاتِ اقبال، ص ۱۱۳۴)

مسئلہ فلسطین بھی اقبال کی شاعری کا مستقل موضوع رہا ہے، ضربِ کلیم کی نظمیں شام و فلسطین اور فلسطینی عرب سے اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ مسلم مشرقی ممالک میں اقبال افغانستان کی قوم سے بھی خصوصی محبت رکھتے ہیں۔ 'ضربِ کلیم' میں بیس نظموں پر مشتمل ایک حصہ محرابِ گل افغان کے افکار کے عنوان سے شامل ہے۔ اقبال کا نظریہ یہ ہے کہ اس قوم کی خودی کہساروں میں خوابیدہ ہے جسے بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔ 'بالِ جبریل' کی نظم نادر شاہ افغان اور 'خوشحالی خاں کی وصیت' افغان قوم سے ایسی محبت کا شاخسانہ ہے۔

ایران بھی اقبال کے شعورِ مشرق کی وحدت کی مرکزی اکائی ہے۔ ایران نے جب رضا پہلوی کی قیادت میں یورپ سے آزادی حاصل کی تو اقبال نے اسے سراہا لیکن جلد ہی ترکی کے کمال اتاترک کی طرح رضا پہلوی نے بھی تقلید کی روش اپنا کر اقبال کو مایوس کر دیا۔

مصطفٰے نہ رضا شاہ میں ہے اس کی نمود
کہ روحِ مشرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

(کلیاتِ اقبال، ص ۱۱۳۴)

مصر، عراق، شام دورِ سر زمیں حجاز سے اقبال کی عقیدت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ خاص طور پر حجاز کو وہ مشرقی اقوام کی رشتہ کی بنیادی کڑی تصور کرتے تھے۔ حجاز کے شہروں، کرداروں اور تاریخی حوالوں کی طرف والہانہ محبت کا اظہار ملتا ہے لیکن جب پہلی جنگ عظیم میں عربوں کا کردار ملت اسلامیہ پر ذاتی مفاد کو ترجیح دینے والی قوم کے طور پر اُبھرا تو اقبال نے روح محمد ﷺ کے حضور فرمایا۔

زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر
یہ فرنگی مدِ نیت کہ جو ہے خود لب گور

(اقوامِ مشرق، ص ۹۲۶)

یہاں آخری مجموعہ ارمغانِ حجاز کی نظم ابلیس کی مشرق شوریٰ کا ذکر ناگزیر ہے جس میں وہ مغرب کے مکر و فریب اور دوغلے پن کی حقیقت کو کھول کر بیان کرتے ہیں اور اپنی پیش بینی کی بنا پر مشرق کو مثالی قوم بننے کے لیے

سیاسی وحدت کا راستہ دکھاتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ مسلم اقوام مشرق دیگر غیر مسلم مشرقی قوموں کے ساتھ مل کر مغربی استبداد کا مقابلہ کریں۔

ن م۔ راشد:

اقبال کے بعد مشرق کو بطور سیاسی وحدت دیکھنے والے شاعروں میں ن م۔ راشد کا نام سرفہرست ہے۔ راشد بھی غلام مشرق کے باشندے تھے اور دیگر حساس تخلیقی اذہان کی مانند اقوام مشرق کی سیاسی محکومی اور ہزیمت کا درد محسوس کرتے تھے اگرچہ راشد نے مشرق بطور سیاسی وحدت کا جو تصور پیش کیا اُس میں خصوصی طور پر مسلم مشرقی ممالک کا ذکر موجود ہے لیکن وہ اقبال کی مانند ان ممالک کو کلمہ توحید کی بنیاد پر متحد ہونے کا درس نہیں دیتے بلکہ اُن کا خیال ہے کہ مشترکہ مقاصد غلامی کا کرب اور مشترکہ سیاسی حریف ان قوموں کے اتحاد کی وجہ بن سکتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب پہلی جنگ عظیم کے انسانیت سوز نتائج کے بعد دوسری جنگ عظیم کی آگ انسانی ناموس و حیات کا نذرانہ مانگ رہی تھی۔ راشد ۱۹۴۳ء میں فوجی تقرری کے باعث ایران، عراق اور مصر میں تعینات رہے۔ اس تجربے نے اُن کی ہندوستانی سیاسی بصیرت کو مشرقی سیاسی بصیرت میں تبدیل کر دیا۔ تاریخی اور تمدنی نقطہ نظر سے جنگ دوم سے قبل اور مابعد مشرق امریکہ فرانس برطانیہ کی اتحادی فوجی کا غلام تھا۔ مغربی زنجیروں سے نڈھال مشرق راشد کی نظموں میں کثیر الجہت علامات میں جلوہ گر ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ راشد کی ابتدائی رومانی نظموں میں ہی مشرق کی غلامی کی مہیب اور روح ستاں اذیتوں پس منظر کا کام دیتی ہیں۔ اپنے پہلے مجموعہ ماورا کی ابتدائی نظم 'انسان' میں غیر ملکی قوم کے بے جا تصرف سے اُبھرنے والی بے بسی سے راشد چیخ اُٹھے اور 'خواب کی بستی' بسانے پر مائل ہوئے۔ ایسی بستی جو نظم 'زندگی، جوانی، عشق اور حسن' میں وطن کے بحر سے دور سرزمین عجم میں شاید مل سکے۔ یہی نظم راشد کی شاعری میں مشرق کا پہلا حوالہ بن جاتی ہے۔

غلامی کی ذلت سے فرار کی اس کوشش میں مقامی باشندوں کی لاشعوری پیچیدگیوں سے راشد بخوبی واقف تھے اُن کی نظم، انتقام، شرابی اور خودکشی اس دور کے فرار آمادہ ذہنیت کی عکاس ہیں جو مشرقی قوموں میں اسلاف کی قدامت پرستی اور خدا کے تصور سے بغاوت کا جذبہ اُبھارتی ہے اہل مشرق سمجھے ہیں کہ اُن کا کوئی پُرسانِ حال اور خدا نہیں رہا۔

تجھ کو معلوم ہے مشرق کا خدا کوئی نہیں
اور اگر ہے تو سرا پردہ، نسیان میں ہے

(شاعر درماندہ، ص ۹۴)

'ماورا' کے بعد منظر عام پر آنے والا دوسرا مجموعہ 'ایران میں اجنبی' راشد کے مشرقی سیاسی شعور کے حوالے سے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ 'ایران میں اجنبی' کی نظموں میں راشد نہ صرف اہل مشرق کو مغرب کے مکروفریب تاجرانہ ذہنیت اور سیاسی چیرہ دستیوں سے آگاہ کرتے ہیں بلکہ مغربی استبداد کی غارتگری سے فرار حاصل

کرنے کے بجائے بغاوت اور صف آرائی کا مشورہ دیتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا راشد کی اسی سیاسی بغاوت کو مثبت قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''راشد کی یہ بغاوت محض اپنے ملکی معاملات تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ وقت کے ساتھ اس میں کشادگی پیدا ہوئی ہے اور اس کے عمل کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا ہے چنانچہ ان کے دوسرے مجموعہ کلام 'ایران میں اجنبی' کا طرہ امتیاز ہی یہی ہے کہ اس میں راشد نے محض ہندوستان کی محکومی کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہیں کی بلکہ سارے ایشیا پہ مغرب کے غلبے کی مذمت کی ہے۔''

[۵]

''**ایران میں اجنبی**'' کی نظموں میں ایران کا سیاسی ماحول پس منظر بن جاتا ہے جس پر اجنبی قوم کی غارتگری کے نشانات و آثار اور محکوم مشرقی ممالک کے عوام کی ذلت و استحصال کے نقوش دونوں بیک وقت اُبھرتے ہیں جو انہیں آزادی کی شدید خواہش پر اُکساتے ہیں راشد خود کہتے ہیں:

''جنگ کے زمانے کے ایران کو دیکھ کر یہ احساس نہایت شدید طور پر ہوا کہ کیسے ہم سب ایشیائی تاریخی اور جغرافیائی اعتبار سے ایک زنجیر کے ساتھ بندھے ہیں۔''[۶]

اسی حوالے سے پطرس بخاری 'ایران میں اجنبی' کی تمہید (طبع اوّل) میں کہتے ہیں کہ:

''ہمارے ہاں وطنی شاعر بھی ہوئے اور قومی بھی، اخلاقی شاعر بھی اور اشتراکی بھی۔ لیکن جہاں تک میری نگاہ پہنچتی ہے ایشیائی شاعر آپ کے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔''[۷]

اگر بغور جائزہ لیں تو راشد کی اپنی شخصیت اُس دور میں مشرق میں پائے جانے والے تضادات کی ترجمان تھی۔ وہ بیک وقت انگریز فوج میں ملازم یعنی اُن کے جبر کا کارندہ تھے اور دل ایشیا کی آزادی کے نام پر دھڑکتا بھی تھا۔

کوئی مجھ کو دو پرزماں و مکاں سے نکلنے کی صورت بتا دو
کوئی یہ سمجھا دو کہ حاصل ہے کہ ہستی رائیگاں ہے؟
کہ غیروں کی تہذیب کی اُستواری کی خاطر
عبث بن رہا ہے ہمارا لہو مومیائی (پہلی کرن، کلیاتِ راشد، ص ۱۳۰)

راشد ایشیا کے باشندوں کو محکومی اور سیاسی ہزیمت کی بنا پر آتش بازار اور خود غرضی کی دلدل میں پھنسا دیکھتے ہیں تو مشرقی اقوام کو ایک وحدت میں پرونے کے لیے مغرب کے ہاتھوں تذلیل کے نقشے مغربی ناپاک ارادوں کے قصے اور سیاسی حیلوں کے سلسلے قلمبند کرتے ہیں تا کہ اہل مشرق جان جائیں کہ اُن کا درد اور درد کی دوا ایک ہے۔ نظم 'زنجیر' میں راشد نے نفیس استعاروں سے سالہا سال سے غلام بے بس اور مشقت پر مجبور مشرق کو بغاوت پر آمادہ کیا ہے۔

ظلم پروردہ غلامو! بھاگ جاؤ
پردۂ شبگیر میں اپنے سلاسل توڑ کر
چار سو چھائے ہوئے ظلمات کو اب چیر جاؤ
اور اس ہنگام بادآورد کو
حیلہ شب خوں بناؤ! (زنجیر، کلیاتِ راشد، ص ۱۴۴)

راشد کے نزدیک مشرقی محکوم اقوام میں خواجہ سرائی ماضی پرستی بے عملی اور نا اتفاقی وہ فساد کردار ہیں جن کی موجودگی میں آزادی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ نظم 'سومنات' اگرچہ سرزمین ہندوستان استعارہ ہے لیکن راشد اسے پورے ایشیا مما لک کا عکاس بنا دیتے ہیں۔ جہاں بظاہر آزادی کی تحریکوں کا آغاز ہو چکا ہے لیکن دراصل عوام کی آزادی مقصود نہیں ہے بلکہ لیڈروں کو اپنے مفادات عزیز ہیں حقیقی آزادی کے لیے قدامت پرستی ترک کرنی ہوگی۔

عجوزۂ سومنات کے اس جلوس میں ہیں
عقیم صدیوں کا علم لادے ہوئے برہمن
جو اک نئے سامراج کا خواب دیکھتے ہیں
اور اپنی توندوں کے بل پہ چلتے ہوئے مہاجن
حصول دولت کی آرزو میں یہ جبر عریاں
بجھا چکے ہیں جو اپنے سینے کی شمع ایقاں

(سومنات، کلیاتِ راشد، ص ۱۴۶)

سومنات کے علاوہ نظم نمرود کی خدائی وزیر چنیں کیمیا گر اور شاخ آہو میں بھی راشد مشرق کے رہنماؤں کی مفاد پرستی کو بے نقاب کر کے تنبیہ مشرق کا فرض ادا کرتے ہیں۔ نظم 'سبا ویراں' میں سبا ایک سطح پر مشرق کے ذہنی معاشی اور تہذیبی و تخلیقی بنجر پن کی علامت بن جاتا ہے جس کی زمیں پر مغربی عیار غارت گروں کے نقش پا ابھی تک باقی ہیں۔

'**ایران میں اجنبی**' میں ایران پورے ایشیا کی علامت ہے اس لئے راشد مشرقی مما لک کے ناموں کی فہرست نہیں دیتے دراصل وہ مشرق کا ایک نامیاتی سیاسی وحدت کے طور پر ادراک کرنا چاہتے ہیں اسی لیے اپنی نظموں میں ہم ہندوستانی، ہم ایرانی اور ہم عراقی کے بجائے ہم ایشیائی کی اصطلاح بطور صیغہ جمع استعمال کرتے ہیں

مثلاً

کہ آؤ کہ ہے وقت کا یہ تقاضا
کہ ہم ایک ہو جائیں ہم ایشیائی (نارسائی، ص ۱۹۸)

پریشاں و غمگین و تنہا
کہ ہم ایشیائی (طلسمِ ازل، کلیاتِ راشد) ص ۱۴۴
بس اک زنجیر
ایک ہی آہنی کمند عظیم
پھیلی ہوئی ہے
مشرق کے اک کنارے سے دوسرے تک
مرے وطن سے ترے وطن تک
بس ایک عنکبوت کا جال ہے کہ جس میں
ہم ایشیائی اسیر ہو کر تڑپ رہے ہیں (من وسلویٰ، کلیاتِ راشد، ص ۱۹۲)

'ایران میں اجنبی' کی نظموں میں مشرق کی ابتر حالی اور مغربی استبداد کی تصویر کشی کے باوجود راشد مستقبل سے نا اُمید نہیں بلکہ مشرقی اقوام کی سیاسی وحدت سیاسی کامیابی اور آزادی کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ نظم یہ دروازہ کیسے کھلا ؟ میں دروازہ قید اور اسیری کے علامت ہے۔ راشد کی سیاسی بصیرت اُن آثار و امکانات کا شعور رکھتی ہے جو روشِ مستقبل کا پیش خیمہ میں کیونکہ آدھی جنگ ارادے اور ہمت سے جیتی جاتی ہے اس لئے وہ کہتے ہیں:

ابھی ہم نے دہلیز پر پاؤں رکھا نہ تھا
کواڑوں کو ہم نے چھوا تک نہ تھا
کیسے یک دم ہزاروں ہی بے تاب چہروں پہ
تارے چمکنے لگے
جیسے اُن کی مقدس کتابوں میں
جس آنے والی گھڑی کا حوالہ تھا
گویا یہی وہ گھڑی ہو (یہ دروازہ کیسے کھلا؟ کلیاتِ راشد، ص ۱۸۴)

نظم دست ستم گر اور 'تیل کے سوداگر' کا اختتام بھی رجائی لب ولہجہ پر ہوتا ہے۔ 'تیل کے سوداگر' راشد کے تصورِ مشرق کے سلسلے کی سب سے اہم نظم ہے جس میں راشد استعماری مذموم عزائم، سیاسی حیلہ سازی، چاپلوسی، تہذیبی غلبہ، اقتصادی اور معاشی قتل عام قید و بند تازیانے ہر حوالے سے مشرق کے ابتر ال اور مغرب کے خدوخال کو

پیش کیا اور مشترکہ مشرقی کرب کو مشرق کی وحدت کی بنیاد بنا کر ایک خوش آئند مشرق کی خاطر ہاتھ میں ہاتھ دینے کی راہ دکھائی۔

بہاؤ گے آنسو
بہائے ہیں ہم نے آنسو

ہماری نگاہوں نے دیکھے ہیں
سیال سایوں کے مانند گھلتے ہوئے شہر
گرتے ہوئے بام و در
اور مینار و گنبد
مگر وقت مینار ہے
اور دشمن اب اُس کی خمیدہ کمر سے گزرتا ہوا
اُس کے نچلے اُفق پر لڑھکتا چلا جا رہا ہے

میرے ہاتھ میں ہاتھ دے دو!
مرے ہاتھ میں ہاتھ دے دو!
کہ دیکھی ہیں میں نے
ہمالہ الوند کی چوٹیوں پر شعاعیں
انہیں سے وہ خورشید پھوٹے کا آخر
بخارا سمرقند بھی سالہا سال سے
جس کی حسرت کے دریوزہ گر ہیں (تیل کے سوداگر، کلیاتِ راشد، ص ۲۳۸)

اقبال اور راشد کے تصورِ مشرق کا موازنہ کرتے ہوئے خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

''اقبال کی فکر کا محور روحِ مشرق کی بازیافت اس کے کرب تک رسائی اور اسے متحرک اور نامیاتی صورت دینے کی کوششیں ہیں۔ وہ مشرق کی انفعالیت کے بعد اس دور کو محسوس کرنا چاہتا ہے۔ اقبال تو شاعرِ مشرق محض رسماً نہیں کہا گیا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ لقب اس کی شاعری کے اصل سرچشموں تک ہمیں پہنچا دیتا ہے۔ راشد کو اگر یہ لقب نہیں دیا گیا مگر راشد کی شعری کائنات کا احاطہ کیا جائے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس کی شاعری کا مرکز و محور بھی مشرق اور اس کی روح ہے۔''[۸]

''**ایران میں اجنبی**'' کے بعد راشد کا منظر عام پر آنے والا تیسرا مجموعہ لا = انسان کی اشاعت تک مشرق بظاہر مغربی سامراج کے جغرافیائی استبداد سے آزاد ہو چکا تھا اُن کی نظم 'دل مرے صحرا نورد پیر دل' ۱۹۴۹ء کی اسرائیلی پسپائی اور مصر کی پیش قدمی سے مشرق کے خود اعتمادی اور خود شناسی کا ترانہ بن جاتی ہے۔

نغمہ در جاں، رقص بر پا، خندہ بر لب
دل، تمناؤں کے بے پایاں الاؤ کے قریب
دل مرے صحرا نورد پیر دل

یہ تمنا کا بے پایاں الا وگرنہ ہو
ایشیا، افریقہ پہنائی کا نام (بے کار پہنائی کا نام)
یورپ اور امریکہ دارائی کا نام (تکرار دارائی کا نام)
میرا دل، صحرا نورد پیر دل
جاگ اُٹھا ہے مشرق و مغرب کی ایسی یک دلی
کے کاروانوں کا نیا رویا لیے (کلیاتِ راشد، ص ۲۷۷)

مگر اس وقتی کامیابی کے بعد جب مشرق کے باشندوں کو تخلیق اور اظہار کی آزادی میسر نہیں آتی تو راشد انسان کی قدر و قیمت اور مقام کے تعین کو فکر کا محور بنا لیتے ہیں جو ابھی بھی حقیقی آزادی، آزادی فکر اور آزادی اظہار کا متلاشی ہے۔ آزادی اور خودداری راشد کا خواب رہی ہے۔ اسی خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے وہ مشرق کو بطور ایک سیاسی وحدت پیش کرتے ہیں۔ بقول انیس ناگی:

> ''اجمالاً 'ایران میں اجنبی' میں افرنگ کے خلاف بغاوت ایشیائی وحدت، سامراجی قوتوں کے خلاف احتجاج، امن عالم اور اخوت و مساوات، سیاب گریز پا کا احساس، شاعر کی وطن سے دوری، شاعر کی تنہائی اور یادوں کا بیان ملتا ہے۔''[۹]

سلیم احمد

۱۹۷۱ء میں سقوط ڈھاکہ کے سانحہ سے اُس نظریاتی نسل کو شدید دھچکا لگا۔ محمد قیام پاکستان کے وقت پاک سر زمیں کے خواب آنکھوں میں بسائے اپنے گھر بار کاروبار شہر گاؤں آثار بچپن کی یادیں بزرگوں کی ہڈیاں اور لاشعور سے چمٹے ہوئے تہذیبی ڈھانچے کی دھرتی سے ہجرت کے تجربے سے گذری، مہاجر اور پناہ گزیں کہلاتی اور وطن کی محبت میں حالات کی سنگینی کو خندہ پیشانی سے برداشت کر گئی۔ سقوط ڈھاکہ اقتدار و اختیار کے ایوانوں اور فوجی ہیڈ کوارٹروں کی نا عاقبت اندیشی کا وہ، ناگہاں، پُرہول اور اٹل نتیجہ تھا۔ جس سے قومی وجود کی وحدت دولخت ہو گئی۔

مشرقی پاکستان نہیں گیا مشرقی تہذیب وثقافت میں مسلم بھائی چارا اخوت کی روایت ہار ہوگئی۔ سلیم احمد کی طویل نظم 'مشرق' اسی سانحے کے تناظر میں لکھی گئی۔ جو ہر حساس اور باشعور طبقے میں مایوسی کلبیت اور تشکک کے رویے کو جنم دے رہا تھا۔ یہ طویل نظم دو فصلوں اور انیس ضمنی طویل نظموں پر مشتمل ہے۔ جس میں مشرق اور مغرب، غالب اور مغلوب اقوام اور فرد اور اجتماع کا آپسی رشتہ زیر بحث آیا اور مشرق بطور سیاسی وحدت کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ سلیم احمد نے اس نظم میں اپنی ذاتی زندگی کے تجربات کے آئینے میں اپنے دور کے سیاسی اور غیر سیاسی حالات اور اُن کی نفسیاتی پیچیدگیوں کو اُجاگر کر کے آپ بیتی کو جگ بیتی بنا دیا ہے وہ لکھتے ہیں:

> ''ایک شاعر کے پاس ذاتی تجربے کے سوا اور کیا ہوتا ہے ...... اس سے اُس کی ذاتی زندگی چھین لیجیے آپ دیکھیں گے کہ وہ ساحل کی سیپیوں کی طرح خالی ہے ...... اس نظم کی بنیاد میری ذاتی زندگی پر ہے۔''[۱۰]

طویل نظم 'مشرق' کا عنوان اس بات کی غمازی کر رہا ہے کہ سلیم احمد کے تخلیقی تجربے میں مشرقی تہذیب کے اقدار و آثار مرکزیت کے حامل ہیں جو طویل مغربی تسلط کی بنا پر اپنی پہچان کھو بیٹھے ہیں۔ یہی مشرق کی حقیقی ہار ہے اور سلیم احمد بے نام قومیت سے شناخت اور ہار سے جیت کی طرف سفر کرنا چاہتے ہیں۔ نظم 'مشرق' کے پیش لفظ میں سلیم احمد اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ انہوں نے یہ نظم ۱۹۷۱ء میں لکھی ۔ لیکن یہ نظم اُن کے اندر پینتیس ۳۵ سال سے پک رہی تھی۔ والد کی وفات کے بعد انہیں تربیت وتعلیم دینے والے تایا حکیم سید شجاعت ایک مسلم لیگی تھے۔ لکھنو میں اُن کے پاس قیام کے دوران سلیم احمد خاکسار تحریک سے پروفیسر کرار احمد اور کٹر مسلم لیگی محمد حسن عسکری کے لیے بیک وقت عقیدت کا جذبہ رکھنے کے باوجود تھے لیکن بالآخر مسلم لیگ میں شامل ہو کر تحریک پاکستان کے لیے متحرک ہوئے۔ ایوب خان کے آمرانہ دور کے بعد یحییٰ خاں کے منعقدہ انتخابات میں جماعت اسلامی کے اخبار سے وابستہ رہے لیکن الیکشن میں اس جماعت کی شرمناک شکست اور بحرانوں نے اس نظم کو صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیا۔

'مشرق' کی فصل اوّل کی پہلی نظم 'مشرق ہار گیا' کا آغاز کپلنگ کے اس قول سے ہوا کہ مشرق اور مغرب کا ملنا ناممکن ہے جبکہ سلیم احمد کہتے ہیں۔ مشرق تو مغرب کا ایسا غلام بن چکا ہے کہ اُس کا اپنا وجود گم ہو گیا ہے۔ وہ تہذیب مغرب میں تہذیب مشرق کی نفی کر چکا ہے۔ لباس ادب اور خبروں میں مغرب معتبر حوالہ ہے اور بابا فرید اکبر اور اقبال کا کلام مجذوب کی باتیں ہو گئی ہیں۔ یہ تہذیبی پسپائی جنگی شکستوں سے زیادہ تباہ کن ہیں کیونکہ مقابلے کا حوصلہ اور ہار کا احساس انتقام کا عنصر بھی موجود نہیں رہا۔

سن ستاون کی جنگ آزادی کی جنگ نہیں
ایسی ہار تو جیتی جا سکتی ہے (شاید ہم نے جیت بھی لی ہے)
لیکن مشرق اپنی روح کے اندر ہار گیا ہے۔ (مشرق ہار گیا، ص۲)

عارف ثاقب رقمطراز ہیں:

''مشرق ہار گیا، میں نے سلیم احمد کے مشرق کے اس رویے پر دکھ اور کرب کا اظہار کیا ہے کہ مشرق نے اپنی اقدار و حیات سے روگردانی کر کے مغربی طرز احساس کو اپنی تمام روح پر حاوی کر لیا ہے۔ انگریزوں نے جس چابک دستی سے سیاسی فتح حاصل کرنے کے بعد مسلمانوں کی تہذیبی زندگی پر غلبہ حاصل کیا اور پھر مسلمانوں نے جس طرح اپنی بنیادی تعلیمات سے انحراف کیا ہے۔ سلیم احمد کی طویل نظم 'مشرق' کا یہ حصہ یعنی 'مشرق ہار گیا' انہی جذبات کا بھرپور اظہار ہے۔''[۱۱]

مشرق کو بطور سیاسی وحدت پیش کرنے والے شاعر اکثر مشرق اور مغرب کا موازنہ کر کے شرقیت کو مغربی مادیت پرستی پر ترجیح دیتے ہیں۔

سلیم احمد کا موقف بھی یہی ہے کہ مغرب جبلی، جسمانی اور مادی سطح پر زندہ رہنے کا نام ہے جبکہ مشرق جبلتوں کی تطہیر اور تزکیہ نفس پیدا ہونے والی روحانی تہذیب کا امین ہے۔ وہ سورج جو روشنی کا منبع ہے مشرق سے طلوع ہوتا ہے لیکن مغربی اندھیرے اُسے نگل گئے ہیں اس ہار سے شاعر کا خود سے یقین اُٹھ جاتا ہے۔

''میں ہار گیا ہوں''
میں نے اپنے آئینے پر کالک مل دی ہے
اور تصویروں پر تھوکا ہے
ہارنے والے کے چہرے ایسے ہوتے ہیں (مشرق، ص۳)

ضمنی نظم 'میں اور وہ' بیسویں صدی میں مغربی نو آبادی نظام کے خاتمے کے بعد جدید نو آبادی نظام کے تسلط کے احساس کی غماز ہے۔ جس کے زیر اثر ہمارے قدیم مغربی آقا آج بھی مشرق کی قسمت کے مالک ہیں۔ انہوں نے نام و نہاد آزاد ممالک کے سیاسی رہنماؤں کو اپنے مفادات کے مطابق ڈھال رکھا ہے وہ ایک منشی کی طرح غریب عوام کا استحصال کر کے اپنے مغربی آقاؤں انعام و اکرام وصول کرتے ہیں۔ چنانچہ خاص قسم کے رشوت خور، سازشی افسروں اور منافع خور تاجروں کی کثرت ہے۔ ایسے بے عمل اہل مشرق جب خدائی مدد نہیں پاتے تو تشکک کا شکار ہو جاتے ہیں جب کہ خدا تو موجود ہے انسان کھو گیا ہے۔ وہ مشرقی انسان جو مقید یعنی جسم سے روحانیت کی بنا پر مطلق تک جا پہنچتا تھا اب مادیت پرستی کی وجہ سے مقید جسم سے مقید کی جانب سفر کر رہا ہے اور دہشت ناک انجام سر پر کھڑا ہے:

اب تجھ پہ وہ لوگ آئیں گے
جن کی ترکش کھلی قبر ہیں!
جن کے گھوڑوں کے پیروں میں بجلی ہے
دِل کی جگہ سنگ ہیں
.....

اپنے اکلوتوں کے ماتم کے لیے تیار رہو (مشرق، ص ۱۷)

ذیلی نظم 'مکاشفہ' میں مشرقی اقوام اپنی تہذیبی روحانی اور ایمانی قدروں کو دفن کرنے کے بعد میدان حشر میں خدا سے نفرت کے اُمیدوار ہیں کہ یکا یک یوں ہوا:

کہ اک فوج گراں کا کوچ ہے
کوہ و بیاباں میں
اور اس کے پاؤں کی سنگین دھمک
سینہ گیتی میں لرزہ ہے (مشرق، ص ۲۱)

'نام کا سفر' مشرق کی کھوئی ہوئی تہذیبی پہچان کا فوج ہے۔ مغرب بار زنجیر فرسودگی یعنی ناموں سے بیزار ہے جبکہ مشرق میں اسما کا علم انسان کی فضیلت کا باعث رہا ہے۔ مغربی تقلید میں مشرق اپنی شناخت کو مٹا کر اپنی مٹی کی خوشبو سے دور ہوا۔ میں معلق ہے اس نظم میں سلیم احمد نے مشرق کی سیاسی وحدت کے لخت لخت ہونے پر گہرے دکھ کا اظہار کیا ہے۔ وہ ہندوستان سے حجاز و یمن تک کلمہ توحید کے ماننے والوں کو متحد ہونے کا پیغام دیتے ہیں یہیں سے اُمید کی کرن پھوٹتی ہے۔

تو وہ رشتہ لفظ کیا ہے
وہ حجاز و یمن سے
کراں در کراں
ارض در ارض
پھیلا ہوا ہے
وہ ایک نخل طیب
وہ کیا ہے
کسی نے کہا
کلمہ لا الہ ہے

ترے حرف زندہ کی وہ کھیتیاں بوؤں گا
جو ابد تا ابد لہلہاتی رہیں گی (مشرق، ص ۳۸)

اگلا ذیلی عنوان آئینے کھیولی چلیں میں سلیم احمد مشرقی تہذیبی اقدار کی تلاش میں ماضی کی جانب رجعت سے لے کر اپنے جائے پیدائش آباؤ اجداد کے ذکر کے آئینے میں محبت رواداری باہمی التفات غمگساری اور عقیدت کی روایات کو تازہ کرتے ہیں۔ یہیں تحریک پاکستان کے حوالے سے پروفیسر کرار حسین اور حسن عسکری اور دیگر کرداروں زندگی کے سٹیج پر اُبھرتے ہیں۔ ہجرت کے واقعے سے آپ بیتی جگ بیتی بن جاتی ہے یہ حصہ بھائی کی موت کے دکھ

پر اختتام پذیر ہوتا ہے جو نئے وطن میں دفن ہو کر اجنبیت کے تمام احساسات ماند کر دیتا ہے۔

سو چپ چاپ اُن کو لحد میں اُتارا
زمیں میں گیا میرا روشن ستارا
زمین وطن آج تک اجنبی تھی
پر اب اس میں مٹی مری مل گئی تھی
کراچی تو کھولی کی اب سرزمیں ہے
یہ میری امانت ہیں اور تو امیں ہے (مشرق، ص ۸۸)

فضل اوّل کی البم نمبر ۲ اور فصل دوم کی کافی ہاؤس سے نیند کی وادی تک ذیلی نظمیں سلیم احمد کے اُن ذاتی تجربات احباب آثار اور حوالوں پر مبنی مشرقی اقدار و دانش کے ترجمان ہیں۔ یہیں سلیم احمد مشرقی قوموں میں نفی ذات کے بجائے اثبات خودی نئی جستجو نئے پیراہن کی تلاش سے انسان کامل بننے کی راہ سجھاتے ہیں۔ شمیم احمد لکھتے ہیں:

''اس کے مختلف حصے مشرق میں بیسویں صدی کی عالمی انسانی صورتِ حال کو ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ بھائی صاحب کی زندگی اُن کے مشاغل اور دوستوں کے حوالے سے ایک شخصی سفر کی روداد بھی ہے لیکن اس کے ساتھ ایک تمثیلی اور رمزیہ انداز میں زندگی کے مختلف مظاہر اور رویے کا اظہار بھی۔'' [۱۲]

ڈنر میں مشرقی روحانی اقدار سے کٹا ہوا انسان جبلی خواہشات کی تسکین میں صرف حیوانی سطح پر زندہ نظر آتا ہے اسی لیے 'قصر سیاہ' میں سلیم احمد مسلم مشرق کی وحدت کے لیے حضرت حسن اور حضرت حسین کے منتظر نظر آتے ہیں اور مشرق صرف خطہ زمین نہیں بلکہ انداز زندگی وطیرہ زیست اور شیوہ حیات بن جاتا ہے بقول احمد ہمدانی:

''سلیم احمد کے خیال کے مطابق مشرق ایک خط زمین نہیں بلکہ حقیقت کلی کے تناظر میں انسان کی پہچان کا نام ہے۔ ان کے خیال میں کبھی یہ پہچان سورج کی طرح روشن اور تازہ ہواؤں کی طرح اس انداز سے پھیلی اور بکھری ہوئی تھی کہ اسے آنکھوں کی جنبش کے علاوہ سانسوں کی آمد و رفعت میں آسانی سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔'' [۱۳]

یہاں اقبال راشد اور سلیم احمد کی مشرق کے موضوع پر لکھی گئی نظموں کے اسلوب کا سرسری ذکر ناگزیر ہو جاتا ہے کیونکہ خیال کی عظمت بیان کی عظمت کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ ان تینوں مشاعروں کے شعری اسلوب میں موضوع کی یکسانیت اور فنی حربوں کی مماثلت کے باوجود اپنا اپنا رنگ موجود ہے۔

اقبال کی شاعری کا بڑا حصہ تنقید و تنبیہ و تعمیر مشرق کے موضوع پر مبنی ہے۔ اس موضوع کے حوالے سے اُن کی نظموں میں بیک وقت کئی پیرایہ بیان اُبھرتے ہیں وہ کہیں مشرق کے حال زار کی عکاسی کرتے ہوئے اظہار تاسف کرتے ہیں تو کہیں طنزیہ لب و لہجہ اختیار کر لیتے ہیں۔ ایسی نظموں میں تمثیلی اور مکالماتی فنی حربہ بھی نمایاں

ہے۔

گرچہ اسکندر رہا محروم آبِ زندگی
فطرتِ اسکندری اب تک ہے گرمِ نائونوش
بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفیٰ
خاک وخوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش
آگ ہے اولادِ ابراہیم ہے نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے (کلیاتِ اقبال،ص ۴۶۰)

اقبال مسلم اقوامِ مشرق کے مستقبل سے نا اُمید نہیں اس لئے اُن کی شاعری میں رجائی اندازِ بیان بھی خاصہ نمایاں ہے۔جواُن کی نظموں میں جوش بلند آہنگی اور وجدانی لب ولہجہ کو جنم دیتا ہے۔

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے (کلیاتِ اقبال،ص ۳۳۸)

مشرق کے حوالے سے اقبال کی اکثر نظموں میں تاریخ اسلامیہ کے ہیروز اور اہم تاریخی کرداروں کا ذکر سے تلمیحاتی رنگ خاصا چھایا ۔اس کے علاوہ کچھ نظمیں حقیقی اسلامی کرداروں کے اردگرد بنی گئی ہیں۔مثلاً بلالؓ، داغ، فاطمہ بنت عبداللہ، غلام قادر رحیلہ، صدیق، ہمایوں، خضر راہ، طارق کی دُعا، جبریل و ابلیس، نادر شاہ افغان، ہارون کی آخری نصیحت، ابی سینا، محراب گل افغان کے افکار وغیرہ۔

راشد کی نظموں کا دوسرا مجموعہ'ایران میں اجنبی' اُن کے مشرقی وحدت کے تصور کا ترجمان ہے۔اِس مجموعہ میں وہ بھی اقبال کی طرح مشرق کی زبون حالی کے نقشے بناتے ہیں لیکن ان نقشوں میں مذہبی حوالے موجود نہیں بھی یہاں اُن کے لہجے میں طنز بھی موجود ہے مثلاً نظم 'سومنات' میں اہل مشرق کی مفاد پرستی پر طنز کہتے ہیں:

عجوزۂ سومنات کے جلوس میں ہیں
عقیم صدیوں کا علم لادے ہوئے برہمن
جو اک نئے سامراج کے خواب دیکھتے ہیں
اور اپنی توندوں کے بل پہ چلتے ہوئے مہاجن
حصولِ دولت کی آرزو میں یہ جبر عریاں (کلیاتِ راشد،ص ۱۴۶)

راشد کے یہاں بھی اقبال کی طرح مستقبل سے خوش آئینہ خواب وابستہ ہیں اس لئے اُن کا لب و لہجہ پُر امید اور پر جوش ہو جاتا ہے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ راشد تاریخ اور مذہب کے قائل نہ ہونے کے باوجود تاریخ اسلامی کے کرداروں و تلمیحات کو اپنی نظموں میں جگہ دیتے ہیں۔مثلاً سومنات، نمرود کی خدائی، من وسلویٰ، راشد

کردار سازی کے فنی حربے کے دلدادہ ہیں یہی وجہ ہے کہ 'ایران میں اجنبی' کی اکثر نظمیں کرداری نوعیت کی ہیں۔

جن کے مرکزی کردار اپنے مکالموں اور افعال سے غلام مشرق کے کرب کے عکاس ہیں۔ مثلاً نظم میزبان، کیمیاگر، مارسیاہ، تیل کے سوداگر، وزیر چنین اور شاخ آہو وغیرہ یہ کردار مشرق کے سینے والوں کے ساتھ ساتھ دست ستمگر کی حقیقت کو بھی بے نقاب کرتے ہیں اور ان دونوں غلام اور مالک قوم کے آپسی رشتے افسانوی رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ جو اپنے لہجے کے جوش اور بلند آہنگی کے باوجود جذباتیت سے مبرا ہیں۔ ان نظموں کی ہیئت اگرچہ آزاد نظم کی ہے مگر قوافی کا اہتمام اس کی موسیقیت اور اثر انگیزی میں اضافے کا باعث ہے۔

سلیم احمد وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے مشرق کے عنوان سے ایک مسلسل اور طویل نظم لکھی ہے لیکن اس نظم میں مختلف ذیلی عنوانات اور ہیئتیں استعمال ہوئی ہیں۔ سلیم احمد کی نظم اُن کا انداز براہِ راست اور جذباتی نوعیت کا ہے جس کا اعتراف کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''وہ مجھے اس نظم کی ادبی اور شعری اہمیت پر اصرار نہیں، ممکن ہے کہ جمالیاتی اعتبار سے یہ بالکل ناقص نظم ہو لیکن شاعری اگر روح کی پکار اور پوری زندگی کا ثمر ہے تو یہ نظم یقیناً ایسی شاعری ہے جو میرے وجود کی پوری معنویت کا اظہار کرتی ہے۔''[۱۴]

کئی ہزار مصرعوں پر مبنی نظم میں فنی معیار کو یکساں قائم رکھنا مشکل کام ہے سلیم احمد نے یہ نظم ایک خاص جذباتی کیفیت میں کہی ہے اس لئے کرب کا اظہار بہت برملا اور طنز کی کاٹ خاصی تیزی ہے۔ نظم مکاشفہ تاثیر کے اعتبار سے خاصی متاثر کن ہے۔ ہیئت کے اعتبار سے مشرق ہارا گیا۔ نظم سے لے کر آیئے کھیولی چلتے ہیں تک کا اکثر حصہ نظم آزاد میں ہے لیکن آیئے کھیولی چلتے ہیں میں اچانک ہیئت مثنوی کی ہیئت میں ڈھل جاتی ہے۔

مرے باپ کے پانچ بھائی سخاوت!
شجاعت، لیاقت، لطافت، رفاقت،
سخاوت تھے سب سے بڑے اُن کے بھائی
انہیں دیکھنے کی سعادت نہ پائی

کچھ تقریباً دس صفحات کے بعد نظم کی ہیئت پھر آزاد ہو جاتی ہے اس نظم کے آخری چند اشعار اور مثنوی اور آزاد نظم کی ہیئت کا یہ سلسلہ آخر تک چلتا ہے البتہ آخری نظم نیند کی وادی میں الفاظ کی تکرار سے خاص قسم کی تال کا تاثر ملتا ہے اور شعور کی رو کی تکنیک کا احساس ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر سلیم احمد کی مشرق کردار نگاری کے حوالے سے اپنی مثال آپ ہے۔ اُردو میں شاید ہی کوئی دوسری طویل نظم اتنے مختلف النوع حقیقی کرداروں کے خاکے پیش کر سکتی ہو۔ کردار کے مکالمے اعمالی اور افعال اُن کے ظاہر و باطن کو بے نقاب کرتے ہیں اور ایک عہد نامہ ترتیب پاتا ہے۔

بقول احمد ہمدانی:

> ''اس کے مصرعوں کا آہنگ اس کے احساس کا آئینہ ہے۔ یہ آہنگ خارجی اوزان اور بحور یا لے اور سُر سے الگ داخلی رنگ و ترنگ کی موسیقی ہے۔''[۱۵]

مجموعی طور پر اُردو نظم میں مشرق بطور سیاسی وحدت اقبال راشد اور سلیم احمد کے حوالے سے دیکھا جائے تو تین شاعر ہیں۔ مختلف ادوار اور اُن کے تقاضوں کے مطابق مشرق کی بقا کے لیے اتحاد و وحدت کا درس دیتے ہیں۔ اوّلین دور اقبال کا ہے جب مشرقی دانش میں تنقید مغرب اور تنبیہ مشرق کا متوازن رویہ رائج نہ تھا۔ اقبال نے وحدت اقوام مشرق کا تصور ایمانی بنیادوں پر اُستوار کیا اور نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کا شعر مسلم و غیر مسلم مشرقی قوموں کو اتحاد و تنظیم کا پیغام دیتے ہیں۔ اقبال کے بعد کے دور میں راشد مذہبی روایت کا پابند نہ تھا۔ اس لئے ایشیا کی سیاسی وحدت کی بنیاد مذہب کے بجائے مشترکہ زنجیر کرب پر رکھتا ہے۔ سلیم احمد پاکستان بننے اور مشرقی پاکستان کے کھو دینے کے بعد مشرق کے تہذیبی ہار کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ آج جب مشرق اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا ہے ان شعراء کی نظموں کی معنویت کے نئے امکانات روشن ہو گئے ہیں۔

حواشی :

۱۔ ایڈورڈ سعید: **شرق شناسی** (مترجم: محمد عباس)، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، س ن، ص ۵۔

۲۔ فرمان فتح پوری: **اقبال سمب کے لیے**، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۱۸۴۔

۳۔ ابو الحسن علی ندوی: **نقوش اقبال**، (مترجم: شمس تبریز خاں) کراچی: مجلس نشریات اسلام، س ن۔ ص ۸۱۔

۴۔ فتح محمد ملک: **فلسطین اُردو ادب**، اسلام آباد: برق سنز پرنٹرز لمیٹڈ، ۱۹۸۳ء، ص ۱۳۔

۵۔ وزیر آغا: **جدید نظم کی کروٹیں**، لاہور: مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۷۴ء، ص ۷۲۔

۶۔ ن م راشد: ایک مصاحبہ، **لا - انسان**، لاہور: الشال ۱۹۶۹ء، ص ۱۵-۱۶۔

۷۔ پطرس بخاری: **ایران میں اجنبی**، لاہور: الشال، ۱۹۶۹ء، ص ۱۴۹۔

۸۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، **راشد کا ذہنی ارتقا**، رسالہ شعر و حکمت، راشد نمبر، حیدر آباد: ہندوستان، ۱۹۷۱ء، ص ۲۶۔

۹۔ انیس ناگی: **سرود نو سے استانزے تک**، مقالہ برائے ایم اے اُردو، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۱ء ص ۶۹

۱۰۔ سلیم احمد: پیش لفظ 'مشرق'، کراچی: مکتبہ نیا ادب، ۱۹۸۹ء، ص (ج)

۱۱۔ عارف ثاقب: سلیم احمد کی طویل نظم، مشرق کا مطبوعہ حصہ، مشمولہ **روایت ۴، بیادِ سلیم احمد** مرتب جمیل پانی پتی، لاہور: مکتبہ روایت، ۱۹۸۷ء، ص ۲۴۷۔

۱۲۔ شمیم احمد: چند ضروری گذارشات، **مشرق**، کراچی: مکتبہ نیا ادب، ۱۹۸۹ء، ص (ی)

۱۳۔ احمد ہمدانی: مشرق ہار گیا ابتدائیہ، مشمولہ، **روایت ۴، بیادِ سلیم احمد**، مرتب جمال پانی پتی، لاہور: مکتبہ روایت، ۱۹۸۷ء، ص ۲۴۷۔

۱۴۔ سلیم احمد: پیش لفظ **مشرق**، کراچی: مکتبہ نیا ادب، ۱۹۸۹ء، ص (ج)

۱۵۔ احمد ہمدانی: **مشرق** ہار گیا، ابتدائیہ مشمولہ **روایت ۴ بیادِ سلیم احمد** (مرتب: جمال پانی پتی) لاہور: مکتبہ روایت، ۱۹۸۷ء، ص ۲۴۲۔

بنیادی ماخذ:

۱۔ اقبال، **کلیاتِ اقبال**، لاہور: مکتبہ جمال، ۲۰۰۲ء۔

۲۔ سلیم احمد، **مشرق**، کراچی: نیا ادب، ۱۹۸۹ء۔

۳۔ ن م راشد، **کلیاتِ راشد**، لاہور: ماورا پبلشرز، س ن۔